یہ کہہ کر سیوتی وہاں سے کھسک گئی۔ چندرا نے گھونگھٹ اٹھا کر کہا ''وہاں جا کر بھول جاتے ہو'' رادھا چرن (گلے سے لگا کر) ''جب ہی سینکڑوں کوس سے چلا آتا ہوں''

8

بارات کی رخصتی

بارات دھوم دھام سے گئی اور تین دن مقیم رہی۔ شب و روز عیش و مسرت کے جلسے ہوتے رہے۔ پہلے دن آدھی رات کے وقت منڈپ کے نیچے شادی کے مراسم ادا کیے گئے۔ تمام باراتی فرش پر بیٹھے۔ برجن ایک شنگرفی رنگ کی ساڑھی پہنے، لمبا سا گھونگھٹ نکالے آئی اور کملا چرن کی بغل میں بٹھائی گئی، ہون ہوا پھر سنسکرت کے شلوک پڑھے گئے۔ جو دولہا دلہن کی سمجھ میں بالکل نہ آئے۔ عورتوں نے سہاگ کے گیت گائے۔ پھر دولہا دلہن نے سات بار ہون کنڈ کو طواف کیا۔ اس کے بعد دولہا کوہبر میں گیا۔ جہاں عورتوں نے اسے برجن کا جوٹھا پان کھلایا تا کہ وہ ہمیشہ بیوی کا غلام بنا رہے۔ اس سے غزل پڑھنے کی فرمائش کی گئی جس کی تعمیل وہ نہ کر سکا۔ پھر اس کی وضع قطع اور حسب و نسب کی ہنسی آرائی گئی۔ اس کی ماں اور باپ اور بہنوں کو خدا معلوم کیسی فحش گالیاں دیں جو دولہا کو ذرا بھی ناگوار معلوم نہیں ہوئیں۔ بلکہ وہ خوش ہو ہو کر سنتا رہا۔ دوسرے دن دس بجے کلیوا کی رسم ادا ہوئی۔ نوشہ مع خاص خاص رشتہ داروں کے آنگن میں آ بیٹھا۔ باسی پوریاں اس کے سامنے رکھی گئیں۔ منشی سنجیون لال نے پانچ اشرفیاں تھالی کے پاس رکھ دیں اور چمکار کر کہا بیٹا کھاؤ، مگر نوشہ نے ہاتھ نہ بڑھایا۔ تب ایک سونے کی انگوٹھی، ایک دوشالہ جس پر زریں کام ہوا تھا، ایک چاندی کا گلاس، دو چاندی کے کٹورے اور کچھ برتن لا کر رکھ دیئے گئے۔ تس پر بھی نوشہ نے پوریوں کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ سنجیون لال نے رادھا چرن کی طرف دیکھا۔ مگر بجائے اجازت کے ممانعت پائی۔ سنجیون لال گھر

میں گئے۔ ایک موہن مالا اور دو انگوٹھیاں اور لائے اور پھر نوشہ سے ماحضر تناول فرمانے کی درخواست کی۔ رادھا چرن نے کملا سے کہا ''خاموش کیوں بیٹھے ہو۔ جو کچھ عرض کرنا ہو تو صاف صاف دیوان صاحب سے کرو'' کملا کے بہنوئی پران ناتھ نے کہا ''نوشہ کی طرف سے میں ایک گھوڑے کی درخواست کرتا ہوں''

سبھا سے کہا ''یہ لوگ پورے ڈاکو ہیں۔ دو ڈھائی سو ڈکار گئے۔ اب سواری کے لیے گھوڑا مانگتے ہیں'' سبھا نے جوابا دیا ''دے دیجئے گھوڑا ان کی خواہش تو پوری ہو'' منشی جی نے مجبور ہو کر اپنی ٹمٹم کا گھوڑا دیا۔ تب کملا چرن نے نوالہ اٹھایا اور گن کر پانچ بار لقمہ منہ تک لے گئے۔ شام کے وقت باراتیوں کی ضیافت ہوئی، تکلف سے کھانا رکھا گیا۔ لوگ کھانے بیٹھے۔ ڈومنیاں اندر گانے لگیں۔

آپ تو لالہ نیوتے میں آئے، میا کسے دے آئے، ارے بہنا کسے دے آئے
پھوپھی تمہاری مد کی ماتی، اس کو نہ کیوں لائے آئے، کسے سونپ آئے

منشی پیارے لال نے فرمایا پران ناتھ گالیوں کے ازحد مشتاق ہیں، ڈومنیوں نے دوسرے گیت میں ان کی خبر لی۔

بہن تمہاری بہت سیانی، گھر گھر ہوت بکھان، تم ہو ابھی نادان
سیج پہ اس کی نسن دن آتے دس دس بجن سجان تم ہو ابھی نادان

ڈپٹی شیاما چرن نے فرمایا پیارے لال کو کیوں چھوڑتی ہو، ان کی بہن کا نام چمپا ہے

ڈومنیوں نے گایا

چمپا تیری کلیاں بہت سہانی رنگ تیرا مجھے بھایا، رنگ تیرا مجھے بھایا
تری صورتیا چت سے نہ اترے تو نہ مجھے اپنایا رنگ تیرا مجھے بھایا

اسی طرح فرمائشیں کر کر کے لوگ گالیاں سنا کیے۔ کوئی باقی نہ بچا۔ یہاں تک کہ گاتے گاتے ڈومنیوں کا جی اکتا گیا۔ مگر سننے والوں کو سیری نہ ہوئی۔

منشی پیارے لال نے پھر تازہ فرمائش کی۔ڈومنیوں نے فحش گالیاں دینی شروع کیں۔آخر آٹھ بجتے بجتے کھانا ختم ہوا۔تیسرے دن رخصتی کا وقت تھا۔علی الصبح باراتی اصحاب منڈپ کے نیچے جمع ہوئے۔منشی سنجیون لال اور ان کے رشتہ دار باراتیوں سے بغلگیر ہوئے۔نو بجے بارات رخصت ہوگئی۔آئی تھی کس شان سے،گئی بالکل اس طرح جیسے کوئی شکست خوردہ فوج،گائنوں نے رخصتی کے گیت گائے۔منشی شیاما چرن نے گالیاں گانے کے لیے ایک اشرفی انعام دی۔کملا چرن اندر گئے۔ساس نے چھاتی سے لگایا۔چلتے وقت پانچ اشرفیاں نذر کیں۔شادی بڑی خوبی سے انجام کو پہنچی۔شہر میں چاروں طرف واہ واہ کی دھوم مچ گئی۔

9

حسد

پرتاپ چند نے برجن کے گھر آنا جانا شادی کے کچھ دن پہلے ہی سے ترک کر دیا تھا۔شادی کے کسی کام میں شریک نہ ہوا حتیٰ کہ محفل میں بھی نہ گیا۔مغموم صورت بنائے منہ لٹکائے اپنے کمرے میں بیٹھا رہا۔منشی سنجیون لال،سوشیلا،سیاما سب خاشامدیں کرکر ہار گئے۔مگر اس نے بارات کی طرف رخ تک نہ کیا۔آخر منشی جی کبیدہ خاطر ہو گئے اور پھر اس سے کچھ نہ کہا۔یہ کیفیت شادی ہونے تک تھی۔شادی کے بعد تو اس نے ادھر کا راستہ ہی ترک کر دیا۔مدرسہ جاتا تو اس طرح کتراتا ہوا بھاگتا،گویا سامنے کوئی شیر بیٹھا ہوا ہے۔یا جیسے تقاضا کرنے والے مہاجن کے سامنے سے مقروض آدمی نظریں بچا کر گزر جاتا ہے،برجن کی تو پرچھائیں سے بھاگتا۔اگر کبھی اسے اپنے گھر میں دیکھ پالیتا تو اندر قدم نہ رکھتا۔ماں سمجھاتی ”بیٹا تم برجن سے بولتے چالتے کیوں نہیں کیوں اس سے من موٹا کیے ہوئے ہو۔وہ آ آ کر گھنٹوں روتی ہے کہ میں نے کیا کیا ہے کہ جس سے یہ ناراض ہو گئے۔دیکھو تم اور وہ کتنے دنوں تک ایک ساتھ رہے۔تم اسے کتنا پیار کرتے تھے۔یکا یک تم کو یہ کیا ہو

گیا۔ اگر تم اسی طرح روٹھے رہے تو غریب لڑکی کی جان پر بن جائے گی۔ سوکھ کر کانٹا ہوگئی ہے۔ ایشور جانتا ہے مجھے اس کو دیکھ کر ترس آتا ہے۔ سوائے تمہارے ذکر کے اسے جیسے کوئی دوسری بات ہی نہیں معلوم" پرتاپ آنکھیں نیچی کیے یہ سب سنتا اور چپ چاپ سرک جاتا۔

پرتاپ اب کمسن بچہ نہ تھا۔ اس کی زندگی کے پودے میں شباب کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ اس نے بہت دنوں سے، اسی وقت سے جب کہ اس نے ہوش سنبھالا، اپنے طفلانہ خوابوں میں برجن کی زندگی کو اپنی زندگی میں شیر وشکر کی طرح ملا لیا تھا۔ ان دلفریب اور سہانے خوابوں کا اس بے دردی اور بے رحمی سے خاک میں ملایا جانا اس کے نازک دل کو پارہ پارہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ جو اپنے خیال میں برجن کا سب کچھ تھا کہیں کا نہ رہا اور وہ جس نے برجن کو ایک لمحہ کے لیے بھی خیال میں جگہ نہ دی، سب کچھ ہوگیا۔ اس خیال سے اس کے دل میں جھنجلاہٹ پیدا ہوتی اور جی چاہتا کہ جن لوگوں نے میرا طلسم خواب توڑا اور میری زندگی کی آرزوئیں یوں مٹی میں ملائی ہیں انہیں بھی جلاؤں اور رسلطاؤں۔ سب سے زیادہ غصہ اسے جس پر آتا وہ غریب سوشیلا تھی۔ رفتہ رفتہ اس کی یہ حالت ہوگئی کہ جب مدرسہ سے آتا تو کملاچرن کے متعلق کوئی نہ کوئی روایت ضرور بیان کرتا۔ خصوصاً اس وقت جب کہ سوشیلا بیٹھی ہوتی۔ اس غریب کا دل دکھانے میں اسے خاص مزہ آتا۔ اگرچہ جھوٹ بولنے کی اسے عادت نہ تھی۔ جو کچھ وہ کہتا وہ حقیقت ہوتی۔ مگر نادانستہ طور پر اس کا طرز بیان اور انداز تقریر کچھ ایسا دلخراش ہوجاتا کہ سوشیلا کے جگر میں تیر کی طرح چبھ جاتا۔ آج میاں کملاچرن تپائی کے اوپر کھڑے تھے۔ سر آسمان سے باتیں کرتا تھا مگر بے حیا اتنے کہ جب میں نے ان کی طرف اشارہ کیا تو کھڑے کھڑے ہنسنے لگے۔ آج بڑا مزہ آیا۔ کملا نے ایک لڑکے کی گھڑی اڑا دی۔ اس نے ماسٹر صاحب سے شکایت کی۔ اس کے قریب ہی یہی حضرت بیٹھے ہوتے تھے۔ ماسٹر نے تلاشی لی تو آپ

کے از را بند میں گھڑی ملی۔ پھر کیا تھا بڑے ماسٹر کے یہاں نالش ہوئی۔ وہ سنتے ہی گھبرا اٹھے اور کوئی تین درجن قمچیاں رشید کیں۔ سڑاسڑ، سڑاسڑ تمام اسکول تماشا دیکھتا تھا۔ جب تک قمچیاں پڑا کیں حضرت دادافریاد فرماتے رہے، مگر باہر نکلتے ہی کھلکھلانے لگے۔ اور مونچھوں پر تاؤ دیا۔ چچی نے سنا آج لڑکیوں نے عین مدرسے کے دروازے پر کملا چرن کو پیٹا۔ مارتے مارتے بیدم کر دیا۔ علی ہذا آئے دن اسی قسم کی وارداتیں بیان کرنے کو مل جاتیں۔ سوشیلا سنتی اور سن سن کر کڑھتی۔ ہاں پرتاپ اس قسم کی کوئی بات برجن کے سامنے نہ کرتا۔ اگر وہ گھر میں بیٹھی بھی ہوتی تو جب تک وہ چلی نہ جائے یہ تذکرہ نہ چھیڑتا۔ اسے منظور نہ تھا کہ میری کسی بات سے اسے صدمہ پہنچے۔ پرتاپ کی روایتوں کی تائید اتفاقیہ طور پر منشی سنجیون لال نے بھی کئی بار کی۔ کبھی کملا بازار میں بلبل لڑاتے مل جاتا۔ کبھی شہدوں کے ساتھ سگریٹ پیتے پان چباتے بدوضعی سے گھومتا ہوا نظر آجاتا۔ منشی جی داماد کی یہ کیفیت دیکھتے تو گھر آتے ہی بیوی پر غصہ اتارتے۔ یہ سب ہی تمہاری کرتوت ہے۔ تمہیں رتجھی ہوئی تھیں کہ گھر اور بر دونوں اچھے ہیں۔ انہیں اس وقت یہ خیال نہ رہتا کہ جتنا الزام سوشیلا پر ہے کم از کم اتنا ہی مجھ پر ہے۔ وہ بے چاری تو چار دیواری میں بند تھی۔ اسے کیا خبر کہ لڑکا کس قماش کا ہے۔ سامدرک ودیا تھوڑی پڑھی تھی۔ اس کے ماں باپ کو شریف دیکھا۔ اس پر عالی خاندان، ذی رتبہ راضی ہوگئی۔ مگر منشی جی نے محض کاہلی اور سہل انگاری کی وجہ سے چھان بین نہیں کی۔ حالاں کہ انہیں اس کے بہت سے مواقع حاصل تھے۔ اور منشی جی کے بے شمار بھائی اب بھی ہندوستان میں موجود ہیں جو اپنی پیاری لڑکیوں کو اسی طرح آنکھیں بند کر کے کنویں میں دھکیل دیا کرتے ہیں۔

سوشیلا کو برجن سے زیادہ عزیز کوئی چیز نہ تھی۔ برجن اس کی جان تھی۔ اس کا دین تھی، اس کا ایمان تھی، اس میں اس کی جان بستی تھی۔ وہ اس کی آنکھوں کا نور اور اس کے دل کا سرور تھی۔ اس کا سب سے بڑا ارمان یہ تھا کہ میری پیاری برجن کسی اچھے

گھر جائے۔ اس کے ساس سسر دیوی دیوتا ہوں۔ اس کا شوہر شرافت کا پتلا اور شری رام چندر جی کی طرح سوشیل ہو۔ اس پر کسی آزار کی پرچھائیں بھی نہ آنے پائے۔ اس نے مرمر کر بڑی منتوں سے یہ لڑکی پائی تھی اور اس کی یہ آرزو تھی کہ اس رسیلی آنکھوں والی اپنی بھولی بھالی لڑکی کو مرتے دم تک اپنی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دوں گی۔ اپنے داماد کو بلاؤں گی، اپنے گھر رکھوں گی، برجن کے بچے ہوں گے، ان کی پرورش کروں گی، داماد مجھے اماں کہے گا میں اسے لڑکا سمجھوں گی، جس دل میں یہ ارمان ہوں اس پر ایسی ایسی دل آزار اور دلخراش باتوں کا جو کچھ اثر ہوگا ظاہر ہے۔

افسوس! غریب سوشیلا کے سارے ارمان خاک میں مل گئے۔ اس کی ساری آرزوؤں پر اوس پڑ گئی۔ کیا سوچتی تھی اور کیا ہو گیا۔ اپنے دل کو بار بار سمجھاتی کہ ابھی کیا ہے۔ سمجھ آجائے گی تو یہ سب باتیں آپ ہی چھوڑ دے گا۔ مگر ایک شکایت کا زخم بھرنے نہ پاتا کہ پھر کوئی تازہ واردات سننے میں آجاتی۔ اس طرح زخم پر زخم پڑتے گئے۔ ہائے نہیں معلوم برجن کے بھاگ میں کیا بدا ہے۔ کیا یہ حسن و شعور کی پتلی، میرے گھر کا اجالا، میرے جسم کی جان، اس بدقماش آوارہ شخص کے ساتھ زندگی کاٹے گی، کیا میری شیاما اسی گدھ کے پالے پڑے گی۔ یہ سوچ کر سوشیلا رونے لگتی۔ اور گھنٹوں روتی، پہلے برجن کو کبھی کبھی ڈانٹ ڈپٹ بھی دیا کرتی تھی۔ اب بھول کر کوئی بات نہ کہتی۔ اس کی صورت دیکھتے ہی اسے رحم آجاتا، ایک لمحہ کے لیے بھی نظروں سے دور نہ ہونے دیتی۔ اگر ذرا دیر کے لیے وہ سباما کے گھر چلی جاتی تو اس کے پیچھے لگی خود بھی جا پہنچتی ایسا معلوم ہوتا گویا اسے کوئی چھینے لیے جاتا ہے۔ جس طرح اپنے بچے کو قصائی کے بغدے کے نیچے دیکھ کر گائے کا رواں رواں کانپنے لگتا ہے، اسی طرح برجن کی مصیبت کا خیال کر کے سوشیلا کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہو جاتی۔ ان دنوں برجن کو دم بھر کے لیے نگاہوں سے دور کرتے اسے وہ قلق اور گھبراہٹ ہوتی تھی جو چڑیا کو گھونسلے سے بچوں کے کھو جانے پر ہوتی ہے۔

سوشیلا ایک تو یوں ہی دائم المریض تھی۔ اس پر آئے دن کی کوفت اور جلن نے اسے اور بھی گھلا ڈالا۔ بیٹی کی فکر سوہان روح ہوگئی۔ شکایتوں نے کلیجہ چھلنی کر دیا۔ چھ مہینے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ تپ دق کے آثار نمودار ہو گئے۔ پہلے تو ہفتۂ عشرہ تک طبیعت پر زور ڈال کر اپنا آزار دل چھپاتی رہی۔ مگر آخر کب تک؟ مرض بڑھنے لگا اور طاقت نے جواب دیا۔ قیدی بستر ہوگئی، حکیم اور ڈاکٹر علاج کرنے لگے، تین چار مہینے میں حالت ایسی نازک ہوگئی کہ معالجوں نے بھی علاج سے ہاتھ اٹھالیا۔ برجن اور سباما شب و روز اس کے پاس بیٹھی رہتیں۔ برجن ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہونے پاتی۔ اسے اپنے پاس نہ دیکھ کر سوشیلا بدحواس سی ہو جاتی اور چیخ چیخ کر رونے لگتی۔ منشی سنجیون لال پہلے تو سرگرمی سے علاج کرتے رہے مگر جب دیکھا کہ کسی دوا سے فائدہ نہیں ہوتا اور مریضہ کی حالت روز بروز ابتر جاتی ہوتی ہے تو آخر انہوں نے بھی مایوس ہو کر ہمت چھوڑ دی۔ آج سے کئی سال پہلے جب سباما بیمار پڑی تھی، اس وقت سوشیلا نے اس کی تیمارداری بڑی جانفشانی سے کی تھی۔ اب سباما کی باری آئی اور اس نے ہمسائیگی اور بہناپے کا حق پورا کر دیا۔ تیمارداری میں اپنے گھر کا کام کاج بھول گئی۔ دو دو تین تین دن تک پرتاپ سے بولنے تک کی نوبت نہ آتی۔ اکثر وہ بے کھانا کھائے ہی مدرسہ چلا جاتا مگر کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتا۔ سوشیلا کی حالت نے اب اس کی آتش حسد کو بہت مدھم کر دیا تھا۔ حسد کی آگ محسود کی ترقی اور بہتری کے ساتھ تیز اور مشتعل ہوتی جاتی ہے اور اس وقت بجھتی ہے جب محسود کی زندگی کا چراغ بجھ جاتا ہے۔

جس دن برج رانی کو معلوم ہو جاتا کہ آج پرتاپ بلا کھانا کھائے مدرسہ جا رہا ہے، اس دن وہ سب کام چھوڑ کر اس کے گھر دوڑی جاتی اور کھانے کے لیے ضد کرتی مگر پرتاپ اس سے بات تک نہ کرتا۔ اسے روتے چھوڑ کر باہر چلا جاتا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ برجن کو بے خطا سمجھتا تھا مگر ایک ایسے رشتہ کو جو برس چھ مہینے میں منقطع

ہونے والا ہو وہ پہلے ہی سے توڑ دینا چاہتا تھا۔ تنہائی میں بیٹھ کر وہ آپ ہی آپ گھنٹوں پھوٹ پھوٹ کر روتا مگر ضبط کا مادہ اس کے دل میں کچھ ایسا مضبوط تھا کہ وہ اپنے جوش محبت کو لبو سے باہر نہ ہونے دیتا۔

ایک روز وہ مدرسہ سے آ کر اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ برجن آئی اس کے رخسار آنسوؤں سے تر تھے اور لمبی لمبی سسکیاں لے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسی حسرت اور بے بسی چھائی ہوئی تھی اور نگاہیں کچھ ایسی التجا آمیز تھیں کہ پرتاپ کا ضبط رخصت ہو گیا۔ وہ بیتاب ہو کر اٹھا اور برجن کی آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگا۔ برجن نے آواز سنبھال کر کہا ''للو اب اماں نہ جئیں گی میں کیا کروں'' یہ کہتے کہتے وہ پھر سسکیاں بھرنے لگی۔

پرتاپ یہ خبر سن کر سناٹے میں آ گیا۔ بدحواس دوڑا ہوا برجن کے گھر گیا اور سوشیلا کی چارپائی کے پاس کھڑا ہو کر رونے لگا۔ ہمارا آخری وقت کیسا مبارک ہوتا ہے۔ وہ ہمارے پاس ایسے ایسے بے رخوں کو کھینچ لاتا ہے جو چند دن پہلے ہماری صورت سے بیزار تھے اور جنہیں سوائے اس طاقت کے دنیا کی کوئی دوسری طاقت زیر نہ کر سکتی تھی۔ ہاں یہ وقت ایسا ہی طاقتور ہے وہ جو بڑے بڑے طاقتوروں اور سرکشوں اور دشمنوں کو ہمارا مطیع کر دیتا ہے۔ جن پر ہم کبھی فتح نہ پا سکتے تھے ان پر یہ وقت ہم کو فتح مند بنا دیتا ہے۔ جن پر کسی وقت کسی بھی ہتھیار سے غالب نہ آ سکتے تھے، ان پر یہ وقت باوجود قوی کے مضمحل ہو جانے کے ہم کو غالب کر دیتا ہے۔

آج پورے سال بھر کے بعد پرتاپ نے اس گھر میں قدم رکھا۔ سوشیلا کی آنکھیں بند تھیں مگر چہرہ ایسا شگفتہ تھا جیسے صبح کے وقت کا کنول، آج صبح سے وہ رٹ لگائے ہوئے تھی کہ للو کو دکھا دو، سبھا نے اسی لیے برجن کو بھیجا تھا۔

سبھا نے کہا ''بہن آنکھیں کھولو للو کھڑا ہے''

سوشیلا نے آنکھیں کھول دیں اور اپنے دونوں بازو فرط محبت سے پھیلا دیئے۔

پرتاپ کے دل سے کینہ کا آخری نشان بھی محو ہو گیا۔ اگر ایسے وقت میں بھی کوئی انسان دل میں کینہ کا غبار رہنے دے تو وہ انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ پرتاپ بےفرزندانہ جوش سے آگے بڑھا اور سوشیلا کی آغوش محبت میں جا لپٹا اور دونوں آدھ گھنٹے تک روتے رہے۔ سوشیلا اسے دونوں بازوؤں میں ایسے دبائے ہوئے تھی گویا وہ کہیں بھاگا جا رہا ہے۔ وہ اس وقت اپنے تئیں ملامتیں کر رہا تھا۔ میں ہی اس دکھیا کا جان لیوا ہوں۔ میں نے حسد کے کمینے جذبہ سے مغلوب ہو کر اسے اس نوبت کو پہنچایا ہے۔ میں ہی اس پریم کی مورت کا قاتل ہوں۔ جوں جوں یہ خیالات اس کے دل میں آتے گئے اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔ آخر سوشیلا بولی ''للو! میں دو ایک دن کی اور مہمان ہوں، میرا جو کچھ کہا سنا ہو وہ معاف کر دو''

پرتاپ کی آواز قابو میں نہ تھی، کچھ جواب نہ دے سکا۔

سوشیلا پھر بولی ''نہ جانے کیوں تم مجھ سے ناراض ہو، تم ہمارے گھر نہیں آتے۔ ہم سے باتیں نہیں کرتے۔ جی تمہیں پیار کرنے کو ترس ترس کے رہ جاتا ہے، مگر تم میری ذرا خبر بھی نہیں لیتے، بتاؤ اپنی غریب چچی سے کیوں روٹھے ہوئے ہو۔ ایشور جانتا ہے میں تمہیں ہمیشہ اپنا لڑکا سمجھتی رہی ہوں، تمہیں دیکھ کر میری چھاتی پھول اٹھتی تھی''

یہ کہتے کہتے نقاہت کے باعث اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔ جیسے افق کی اتھاہ وسعت میں اڑنے والی مرغابی کی آواز ہر لحہ مدھم ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی آواز کا صرف خیال باقی رہ جاتا ہے۔ اسی طرح سوشیلا کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے صرف سائیں سائیں رہ گئی۔

10

سوشیلا کی وفات

تین دن اور گزر گئے۔ سوشیلا کے جینے کی اب کوئی آس نہ رہی، تینوں دن منشی سنجیون لال اس کے پاس بیٹھے ہوئے اس کی تشفی کرتے رہے۔ وہ ذرا دیر کے لیے

بھی کسی کام کو چلے جاتے تو وہ بے قرار ہونے لگتی اور رو رو کر کہتی کہ وہ مجھے چھوڑ کر کہیں چلے گئے۔ ان کو آنکھوں کے سامنے دیکھ کر بھی اسے تسکین نہ ہوتی۔ رہ رہ کر ایک مجنونانہ جوش سے ان کا ہاتھ پکڑ لیتی اور مایوسانہ لہجہ میں کہتی مجھے چھوڑ کر کہیں چلے تو نہ جاؤ گے۔ منشی جی گو استقلال کے عادی تھے مگر ایسی باتیں سن کر آبدیدہ ہو جاتے۔ ذرا ذرا دیر میں سوشیلا پر ایک غشی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی، پھر چونکتی اور ادھر ادھر وحشت آمیز نگاہیں ڈال کر پوچھنے لگتی۔ وہ کہاں گئے؟ کیا چھوڑ کر چلے گئے؟ بعض اوقات نسیان کا ایسا غلبہ ہو جاتا کہ منشی جی بار بار کہتے کہ میں بیٹھا ہوا ہوں گھبراؤ نہیں، مگر اسے یقین نہ آتا، انہیں کی طرف تکتی اور پوچھتی کہاں ہیں، یہاں تو نہیں ہیں کہاں چلے گئے، ذرا دیر میں جب ہوش آ جاتا تو خاموش ہو جاتی اور رونے لگتی، تینوں دن اس نے برجن سبا ماپرتاپ اور تینوں میں سے ایک کو بھی یاد نہ کیا۔ وہ سب کے سب ہر دم اس کے پاس کھڑے رہتے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا کہ وہ بجز منشی جی کے اور کسی کو پہچانتی ہی نہیں۔ جب برجن بہت بے قرار ہو جاتی اور اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر رونے لگتی تو وہ ذرا آنکھیں کھول دیتی اور پوچھتی کون ہے؟ برجن؟ بس اور کچھ نہ پوچھتی، جیسے بخیل کے دل میں مرنے کے وقت سوائے اپنے دفینہ کے اور کسی بات کا دھیان نہیں رہتا، اسی طرح ہندو عورت اپنے آخری لمحوں میں سوائے اپنے پتی کے اور کسی کا دھیان نہیں کر سکتی کیوں کہ بخیل کو اپنی دولت سے جتنی محبت ہے اس سے بدرجہا محبت پتی برتا عورت کو اپنے شوہر سے ہوتی ہے۔

کبھی کبھی سوشیلا یکا یک چونک پڑتی، اور ہکا بکا ہو کر پوچھتی "ارے یہ کون کھڑا ہے، یہ کون کھڑا ہے، یہ کون بھاگا جا رہا ہے، انہیں کیوں لیے جاتا ہے۔ نہ میں نہ جانے دوں گی" یہ کہہ کر منشی جی کے دونوں ہاتھوں کو زور سے پکڑ لیتی۔ ایک لمحہ میں جب بے خودی دور ہو جاتی۔ تب شرما کر کہتی میں سپنا دیکھ رہی تھی۔ جیسے کوئی تمہیں لیے جاتا تھا۔ دیکھو تمہیں ہماری قسم جانا نہیں، نہیں معلوم کہاں لے جائے گا۔ ایں،

منشی جی کا کلیجہ مسوسنے لگتا۔ اس کی طرف نہایت محبت آمیز شفقت اور درد سے بھری ہوئی نگاہ ڈال کر بولتے۔ نہیں میں نہ جاؤں گا، تمہیں چھوڑ کر کہاں جاؤں گا، سباما اس کی حالت دیکھتی اور روتی کہ اب یہ کچھ دیر کی اور مہمان ہے، ضرورت نے اس کی شرم وحیا سب دور کر دی تھی۔ منشی جی کے سامنے گھنٹوں بے حجاب کھڑی رہتی۔

چوتھے دن سوشیلا کی حالت سنبھل گئی۔ منشی جی کو یقین ہو گیا کہ بس یہ فیصلہ ہے، چراغ گل ہونے سے پہلے بھڑک اٹھتا ہے۔ سویرے ہی جب منہ دھو کر گھر میں آئے تو سوشیلا نے انہیں اشارے سے اپنے پاس بلا لیا اور بولی کہ مجھے اپنے ہاتھ سے تھوڑا سا پانی پلا دو، آج اس پر نسیان کا غلبہ بہت کم معلوم ہوتا تھا۔ اس نے برجن، سباما اور پرتاپ سب کو بخوبی پہچانا اور برجن کو بڑی دیر تک چھاتی سے لگائے روتی رہی۔ جب پانی پی چکی تو سباما سے کہا بہن ذرا ہم کو اٹھا کر بٹھا دو۔ سوامی جی کے پیر چھو لوں، پھر نہ جانے کب ان کے درشن ہوں گے۔

سباما نے روتے ہوئے اسے ہاتھوں کے سہارے ذرا سا اٹھا دیا۔ پرتاپ اور برجن سامنے کھڑے تھے۔ سوشیلا نے منشی جی سے کہا ''ذرا نزدیک آ جاؤ'' منشی جی اس وقت فرط محبت اور درد سے بے خود ہو کر اس کے سینے سے لپٹ گئے اور روتے ہوئے بولے ''تم گھبراؤ نہیں، ایشور چاہے گا تم آج ہی اچھی ہو جاؤ گی'' سوشیلا نے مایوسانہ انداز سے مسکرا کر کہا ہاں اچھی ہو جاؤں گی، ذرا اپنا پیر بڑھا دو، میں چوم لوں منشی جی ہچکچا رہے تھے اس وقت سباما پہلی بار روتے ہوئے بولی ''پیر بڑھا دیجئے۔ ان کے دل کی آرزو بھی نکل جائے'' تب منشی جی نے پیر بڑھا دیا۔ سوشیلا نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کئی بار چوما اور تب ان پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی اور دم کی دم میں دونوں پیر گرم آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ پتی برتا عورت نے پریم کے موتی شوہر کے قدموں پر نثار کر دیئے۔

جب ذرا آواز قابو میں آئی تو اس نے برجن کا ایک ہاتھ پکڑ کر منشی جی کے ہاتھ میں

دیا اور نہایت دھیمی آواز میں بولی ''سوامی جی آپ کے ساتھ بہت دن رہی اور زندی کا بہت سکھ اٹھایا۔ اب پریم ناطہ ٹوٹتا ہے۔ اب میں دم بھر کی مہمان ہوں، پیاری برجن کو تمہیں سونپے جاتی ہوں۔ میری یہی نشانی ہے اس پر ہمیشہ مہربانی کی نگاہ رکھنا۔ میری قسمت میں اپنی پیاری بچی کا سکھ دیکھنا نہ لکھا تھا۔ اسے میں نے کبھی کوئی کڑی بات نہیں کہی۔ کبھی کڑی نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ یہ میری زندگی کا پھل ہے، ایشور کے لیے تم اس کی طرف سے کبھی بے سدھ نہ ہو جانا'' یہ کہتے کہتے ہچکیاں بندھ گئیں اور غشی سی آ گئی۔

جب ذرا پھر افاقہ ہوا تو اس نے سبھا کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑے اور رو کر بولی ''بہن برجن تمہارے سپرد ہے، تم اس کی ماں کی جگہ ہو، للو! ایشور کرے تم جگ جگ جیو، اپنی بہن برجن کو بھولنا مت، وہ تمہاری غریب ماں کی بہن ہے۔ تم میں اس کی جان بستی ہے۔ اسے رلانا مت، کڑھانا مت، اسے کبھی کڑوی بات مت کہنا۔ اس سے کبھی نہ روٹھنا، اس کی طرف سے بے خبر مت ہونا۔ نہیں تو وہ رو رو کر جان دے دے گی، اس کی بھاگ میں نہ جانے کیا بدا ہے، مگر تم اسے اپنی سگی بہن سمجھ کر سدا اس کی دل جوئی کرتے رہنا، میں ذرا دیر میں تم لوگوں کو چھوڑ کر چلی جاؤں گی، مگر تمہیں میری قسم اس کی طرف سے من موٹا نہ کرنا۔ تم نے اور تمہاری ماں نے اسے آدمی بنایا ہے اور تمہیں اس کا بیڑا پار لگاؤ گے، میرے دل میں بڑے بڑے ارمان تھے، میری لالسا تھی کہ تمہارا بیاہ کر دوں گی، تمہارے بچے کھلاؤں گی، مگر بھاگ میں کچھ اور ہی بدا تھا''

یہ کہتے کہتے پھر بے ہوشی اور نقاہت نے اس پر غلبہ کیا۔ سارا گھر رو رہا تھا، مہریاں، مہراجنیں، نوکر چاکر سب اس کا جس گار رہے تھے، وہ عورت نہیں دیوی تھی

ردھیا: ''اتنے دن ٹہل کرتے ہوئے مگر کبھی کڑی بات نہیں کہی''

مہراجن: ''ہم کو بیٹی کی طرح مانتی تھیں، کھانا کیسا ہی پکا کر رکھ دوں مگر کبھی زچ

نہیں ہوئیں۔ جب بات کرتیں مسکرا کے، مہراج جب آتے تو انہیں جرور سیدھا دلواتی تھیں''

اسی طرح کی باتیں سب کر رہے تھے، دوپہر کا وقت آیا، مہراجن نے کھانا بنایا۔ مگر کھاتا کون؟ منشی جی بڑے اصرار سے گئے اور منہ جوٹھا کر کے چلے آئے۔ پرتاپ نے وہاں سے نہ ٹلنے کی قسم کھالی تھی، برجن اور سباما کو بھوک کہاں؟ سوشیلا کبھی برجن کو پیار کرتی پرتاپ کو چومتی اور کبھی اپنی بیتی کہہ کہہ کر روتی۔ سہ پہر کے وقت اس نے سب نوکروں کو بلایا اور ان سے خطا معاف کروائی۔ جب یہ سب چلے گئے تو سوشیلا سباما سے بولی ''بہن پیاس بہت لگی ہے ان سے کہہ دو ذرا اپنے ہاتھ سے پھر پانی پلا دیں'' منشی جی پانی لائے اور سوشیلا نے ایک گھونٹ بمشکل تمام حلق سے نیچے اتارا۔ اور ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے اسے امرت پلا دیا۔ اس کا چہرہ روشن ہو گیا، آنکھوں میں رس بھر آیا، شوہر کے گلے میں ہاتھ ڈال کر بولی، ''میں کیسی بھاگوان ہوں جو تمہاری گود میں مرتی ہوں'' یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئی، جیسے کوئی بات کہنا چاہتی ہو اور لحاظ سے نہیں کہتی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر منشی جی کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی'' اگر تم سے کچھ مانگوں تو دو گے؟''

منشی جی نے متعجب ہو کر پوچھا ''تمہیں مانگنے کی ضرورت ہے؟ شوق سے کہو''

سوشیلا: ''تم میری بات کبھی نہ ٹالتے تھے''

منشی جی: ''مرتے دم تک کبھی نہ ٹالوں گا''

سوشیلا: ''ڈر لگتا ہے کہیں نہ مانو تو''

منشی جی: ''تمہاری بات اور میں نہ مانوں''

سوشیلا: ''میں تم کو نہ چھوڑوں گی، ایک بات بتلا دو، سلی مر جائے گی تو اسے بھول جاؤ گے؟''

منشی جی: ''ایسی باتیں نہ کرو دیکھو برجن روتی ہے''

سوشیلا: ''بتلا دو مجھے بھولو گے تو نہیں؟''

منشی جی: ''تمہاری یاد مرتے دم تک تازہ رہے گی''

سوشیلا نے اپنے مرجھائے رخسار منشی جی کے ہونٹوں پر رکھ دیئے اور دونوں باہیں ان کے گلے میں ڈال دیں۔ پھر برجن کو قریب بلا کر آہستہ آہستہ سمجھانے لگی، ''دیکھو بیٹی لالہ جی کا ہر دم کہنا ماننا، ان کی سیوا خوب من لگا کر کرنا، گھر کا سارا بوجھ تمہارے ہی اوپر ہے اب تمہارے سوا کون سنبھالے گا''

یہ کہہ کر اس نے شوہر کی طرف درد آمیز نگاہوں سے دیکھا ''میں اپنے من کی بات نہیں کہنے پائی جی ڈوبا جا رہا ہے''

منشی جی: ''تم ناحق پس وپیش کرتی ہو''

سوشیلا: ''تم میرے ہو کہ نہیں؟''

منشی جی: ''تمہارا اور مرتے دم تک تمہارا''

سوشیلا: ''ایسا نہ ہو کہ مجھے بھول جاؤ اور جو چیز میری تھی وہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں چلی جائے''

منشی جی: ''(اشارہ سمجھ کر) اس کا ذکر ہی کیوں کرتی ہو۔ جب تک جیوں گا تمہارا ہی رہوں گا''

سوشیلا نے پھر برجن کو بلایا اور باپ کے قدموں پر گرا دیا اور مارے ضعف کے بے دم ہو گئی۔ برجن اور پرتاپ رونے لگے۔ سامانے سمجھا کہ ٹمٹماتا ہوا چراغ بجھ گیا۔ منشی جی نے کانپتے ہوئے سوشیلا کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ سانس دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ مہراجن کو بلا کر اب انہیں زمین پر لٹا دیا۔ تپ دق نے ہڈیاں تک سکھا ڈالیں تھیں۔

اندھیرا ہو چلا تھا۔ سارے کمرے میں سناٹا چھایا ہوا تھا، حسرت ناک، وحشت ناک سناٹا، وہ سناٹا جو دلوں کو ملول اور متفکر بنا دیتا ہے۔ رونے والے روتے تھے مگر

گلا دبا کر، باتیں ہوتی تھیں مگر دبی آوازوں میں، سوشیلا زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ تن نازک جو کبھی ماں کی گود میں پلا۔ کبھی محبت کے آغوش میں لیٹا، کبھی پھولوں کی سیج پر سویا، اس وقت زمین پر پڑا ہوا تھا، ابھی تک نبض آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ منشی جی فرط الم و یاس سے مایوس اس کے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے۔ دفعتاً سوشیلا کے اعضاء میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے سر اٹھا دیا اور دونوں ہاتھوں سے منشی جی کا پیر پکڑ لیا اور روح پرواز کر گئی۔ دونوں ہاتھ ان کے پیروں کا حلقہ کیے ہی رہ گئے۔

رونے والو روؤ، کیونکہ سوائے رونے کے تم اور کر ہی کیا سکتے ہو۔ تمہیں اس وقت کوئی کتنا ہی سمجھائے مگر تمہاری آنکھیں آنسوؤں کی باڑھ کو نہ روک سکیں گی، رونا تمہارا فرض ہے، زندگی میں رونے کے موقعے شاذ ہی ملتے ہیں۔ کیا اس موقع پر بھی تمہاری آنکھیں بخل کر جائیں گی۔ آنسوؤں کے تار بندھے ہوئے تھے۔ سسکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں کہ مہراجن چراغ جلا کر کمرے میں لائی۔ ذرا دیر پہلے سوشیلا کی زندگی کا چراغ بجھ چکا تھا۔

11

برجن کی رخصتی

رادھا چرن رڑکی کالج سے نکلتے ہی مراد آباد میں انجینئر مقرر ہو گئے اور چندر ان کے ساتھ مراد آباد کو چلی۔ پریم وتی نے بہت روکنا چاہا مگر جانے والے کو کون روک سکتا ہے، سیوتی کب کی سسرال جا چکی تھی۔ یہاں گھر میں اکیلی پریم وتی رہ گئی۔ اس کے سر گھر کا کام کاج تھا۔ آخر یہ رائے ہوئی کہ برجن کی رخصتی کا پیغام دیا جائے۔ ڈپٹی صاحب رخصتی کے سخت خلاف تھے، مگر گھر کے معاملات میں پریم وتی کا حکم قطعی ہوتا تھا۔

سنجیون لال نے پیغام منظور کر لیا۔ کچھ دنوں سے وہ تیرتھ جاترا کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ سوشیلا کے مرنے کے بعد رفتہ رفتہ انہوں نے تمام دنیاوی تعلقات

ترک کر دیئے تھے۔ دن بھر کمرے میں آسن مارے بھگوت گیتا اور یوگ بششٹ اور دوسری معرفت کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے اور شام ہوتے ہی گنگا اشنان کو چلے جاتے۔ وہاں سے رات گئے لوٹتے اور دو چار لقمے کھا کر سو جاتے۔ اکثر پرتاپ چند بھی ان کے ساتھ گنگا نہانے کو جاتا اور اگرچہ پورے سولہ سال کا بھی نہ ہوا تھا مگر مناسبت فطری کہو یا ورثہ پدری یا فیض صحبت کہ ابھی سے اسے اسرار معرفت پر غور و خوض کرنے میں بے حد لطف حاصل ہوتا تھا۔ گیان اور حقیقت کے تذکرے سنتے سنتے اس کا رجحان بھی بھگتی کی جانب ہو چلا تھا۔ اور بعض اوقات منشی جی سے ایسے دقیق مسائل پر بحث کرتا کہ وہ حیرت میں آجاتے۔

برج رانی پر سہاما کی تعلیم کا اس سے بھی گہرا اثر پڑا تھا جتنا پرتاپ چند پر منشی جی کی صحبت اور تعلیم تھا۔ اس کا پندرھواں سال تھا جو ہمارے شباب کی پہلی منزل سمجھی جاتی ہے۔ اس سن میں لڑکیوں پر شوق شنگار کا جنون سوار ہوتا ہے۔ ان کے انداز طریق میں بجائے طفلانہ شوخی کے ایک متانت آمیز چلبلا پن پیدا ہوا جتا ہے۔ دلوں میں شباب کی امنگیں پیدا ہوتی ہیں اور نگاہوں سے بجائے سادگی اور شوخی کے ایک جذبہ آمیز رسیلا پن برسنے لگتا ہے مگر برج رانی ابھی تک وہی بھولی بھالی لڑکی تھی۔ اس کا چہرہ معصومیت کی تصویر تھا۔ ایک ایک انداز سے سادگی ٹپکتی تھی۔ ہاں رفتار میں ایک دل آویز دھیرا پن اور طرز کلام میں لبھانے والی شیرینی پیدا ہو گئی تھی۔ باتیں سننے والے پر موہنی منتر پڑھ دیتی تھیں۔ منہ اندھیرے اٹھتی اور سب سے پہلے منشی جی کا کمرہ صاف کر کے ان کے پوجا پاٹ کا سامان قرینہ سے رکھ دیتی۔ پھر رسوئی کے دھندے میں لگ جاتی دوپہر کا وقت اس کے لکھنے پڑھنے کا تھا۔ سہاما سے اسے جتنی محبت تھی اتنی تو شاید اسے اپنی ماں سے بھی نہ رہی ہو۔ اس کی مرضی برجن کے لیے قانون ہی تھی۔

سہاما کی تو صلاح تھی کہ ابھی رخصتی نہ کی جائے۔ مگر منشی جی مصر تھے اور بدائی کی

تیاریاں ہونے لگیں۔ جوں جوں مصیبت کی گھڑی سر پر آتی جاتی برجن کی بے قراری بڑھتی جاتی۔ رات دن رویا کرتی۔ کبھی باپ کے پیروں پڑتی۔ کبھی سباما کے پیروں سے لپٹ جاتی۔ مگر بیاہی لڑکی پرائے گھر کی ہو جاتی ہے۔ اس پر کسی کا کیا اختیار۔

پرتاپ چند اور برجن کتنے ہی دنوں تک بھائی بہنوں کی طرح ایک ساتھ رہے تھے۔ مگر اب برجن کی آنکھیں اسے دیکھتے ہی نیچے کو جھک جاتیں۔ پرتاپ کو بھی یہی کیفیت تھی۔ گھر میں بہت کم آتا تھا۔ کبھی ضرورت سے آتا تو گویا کچھ اس طرح دلہن کی طرح نگاہیں نیچی کیے ہوئے سمٹا ہوا آتا۔ اس کی نگاہوں میں وہ راز محبت چھپا ہوا تھا جسے وہ کسی متنفس حتیٰ کہ برجن پر بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ایک روز شام کے وقت رخصتی کو صرف تین دن رہ گئے تھے۔ پرتاپ کسی ضرورت سے اندر گیا اور اپنے کمرے میں لیمپ جلانے لگا کہ برجن آئی۔ اس کا آنچل آنسوؤں سے تر تھا۔ اس نے جو دو برس کے بعد پرتاپ کی طرف پر آب نگاہوں سے دیکھا کر کہا۔

''للو مجھ سے کیسے صبر ہوگا؟''

پرتاپ نے مردانہ ضبط سے کام لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آئے۔ اس کی آواز بھاری نہ ہوئی، واعظانہ لہجے میں بولا

''ایشور تمہیں صبر کی طاقت دے گا''

برجن کی گردن جھک گئی۔ آنکھیں زمین میں گڑ گئیں اور ایک دبی ہوئی سسکی نے حسرت و درد کا وہ دفتر بیان کر دیا اور جو زبان سے ناممکن تھا۔

رخصتی کا دن لڑکیوں کے لیے عجیب حسرت کا دن ہوتا ہے۔ بچپن کی سسکھیاں، سہیلیاں، ماں باپ، بھائی بند گھر کے مانوس در و دیوار، ان سب سے ناطہ ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ خیال کہ میں پھر اس گھر میں آؤں گی، اسے مطلق تسکین نہیں دیتا تھا، کیوں

کہ اب وہ آئے گی تو مہمان کی حیثیت سے آئے گی۔ ان لوگوں سے جدا ہونا جن کے درمیان زندگی کے گہوارے میں کھیلنا اور بے فکریوں کے چمن میں سیر کرنا نصیب ہوا ہو، اس کے جگر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ اب تک وہ دنیا کے فرائض اور پابندیوں سے آزاد رہتی تھی۔ مگر آج سے اس کے سر پر ایسا بوجھ لدتا ہے جو مرتے دم تک اٹھانا پڑے گا۔

برجن کا سنگھار کیا جا رہا تھا۔ نائن اس کے پیروں میں مہاور رچا رہی تھی۔ کوئی اس کے سر کے بالوں کو گوندھ رہی تھی۔ کوئی جوڑے میں عطر بسا رہی تھی۔ مگر جس کے لیے یہ تیاریاں کی جا رہی تھیں وہ زمین پر موتی کے دانے یوں بکھیر رہی تھی گویا ان کا کچھ مول ہی نہیں ہے۔

اتنے میں باہر سے پیغام آیا، ساعت ٹلی جا رہی ہے جلدی کرو

سبھاما پاس کھڑی تھی۔ برجن اس کے گلے لپٹ گئی اور وہ جوش محبت جواب تک دبی ہوئی آگ کی طرح سلگ رہا تھا یکبارگی ابل پڑا جیسے کوئی آنچ میں تیل ڈال دے۔

ذرا دیر میں پالکی دروازہ پر آئی۔ برجن پاس پڑوس کی عورتوں سے گلے ملی۔ سبھاما کے پیر چھوئے اور تب دو تین عورتوں نے اسے پالکی کے اندر بٹھا دیا۔ ادھر پالکی اٹھی ادھر سبھاما غش کھا کر زمین پر گر پڑی۔ گویا اس کے جیتے جی کوئی اس کی جان نکال کر لیے جاتا تھا۔ گھر سونا ہو گیا تھا، سینکڑوں عورتوں کا جمگھٹ تھا۔ مگر ایک برجن کے نہ ہونے سے مکان پھاڑے کھاتا تھا۔

12

کملاچرن کے دوست

جیسے سیندور کی سرخی سے مانگ رچ جاتی ہے۔ اسی طرح برج رانی کے آنے سے پریم وتی کے گھر کی رونق دوبالا ہو گئی۔ سبھا نے اسے ایسے گن سکھائے تھے کہ جس نے اسے دیکھا موہا گیا یہاں تک کہ سیوتی کی سہیلی رانی کو پریم وتی کے سامنے اقرار

کرنا پڑا کہ تمہاری چھوٹی بہو نے ہم سبھوں کا رنگ پھیکا کر دیا۔ سیوتی اس سے دن بھر باتیں کرتی اور اس کا جی نہ بھرتا۔ اسے اپنے گانے پر ناز تھا، مگر اس میدان میں بھی برجن بازی لے گئی۔

اب کملاچرن کے دوستوں نے تقاضا کرنا شروع کر دیا کہ بھئی نئی دلہن گھر میں لائے ہو کچھ دعوت جلسہ کی بھی فکر ہے۔ سنتے ہیں نہایت ہی حسین بیوی پائی ہے۔ کملاچرن کو روپیہ تو سسرال میں ملا ہی تھا جیب کھنکھنا کر بولے۔

''اجی دعوت لو، شرابیں اڑاؤ، آنکھیں سینکو، ہاں بہت ہو حق نہ مچانا ورنہ کہیں اندر خبر ہو تو سمجھیں یہ شہدا ہے۔ جب سے وہ گھر میں آئی ہیں، ایں جانب کا قافیہ تنگ ہے۔ سنتا ہوں انگریزی، فارسی، سنسکرت، الم غلم سب گھوٹے بیٹھی ہیں۔ ڈرتا ہوں کہیں انگریزی میں پوچھ بیٹھی یا فارسی میں بات چیت شروع کر دی تو سوائے بغلیں جھانکنے کے اور کیا کروں گا۔ اس لیے ابھی کنی کاٹتا پھرتا ہوں''

یوں تو کملاچرن کے دوستوں کی تعداد لامحدود تھی۔ شہر کے جتنے کبوتر باز کنکوے باز شہدے تھے، سب ان کے دوست تھے۔ مگر دلی دوستوں میں صرف پانچ آدمی تھے اور سب کے سب فاقہ مست، آوارہ، ان میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ میاں مجید تھے۔ کچہری میں عرائض نویس تھے۔ جو کچھ ملتا شراب کی نذر کرتے۔ دوسرا نمبر حمید خاں کا تھا۔ ان ذات شریف نے ورثہ میں بڑی دولت پائی تھی مگر تین سالوں میں سب کچھ ارباب نشاط کی نذر کر دیا۔ اب یہ وطیرہ تھا کہ سج دھج کر شام کو گلیوں کی خاک چھانتے پھرتے اور وقت ضرور پر بازار حسن کی دلالی بھی کیا کرتے۔ اس بازار کے خریداروں اور بیوپاریوں میں ان کی بڑی رسائی تھی۔ تیسرے حضرت سعید حسین تھے۔ ایک ہی شاطر اور قمار باز۔ سینکڑوں کا داؤ لگانے والے، بیوی کے زیوروں پر ہاتھ صاف کرنا روزمرہ کا مشغلہ تھا۔ باقی دو صاحب رام سیوک اور چندو لال کچہری میں ملازم تھے۔ تنخوائیں تھوڑی مگر بالائی آمدنی وافر، نصف شراب کی

نذر کرتے اور نصف شاہدان حسن فروشاں کی خاطر و مدارت میں صرف ہوتی۔ گھر کے لوگ فاقے کرتے یا بھیک مانگتے انہیں صرف اپنے عیش سے کام تھا۔

مشورہ تو ہو ہی چکا تھا۔ آٹھ بجے شب ڈپٹی صاحب لیٹے تو یہ پانچوں حضرات جمع ہوئے اور دور چلنے لگا۔ پانچوں پینے میں حاتم تھے دائم الخمر، جب ذرا سرور گھٹا تو بہکی بہکی باتیں ہونے لگیں۔

مجید: ''کیوں بھئی کملا چرن! سچ کہنا دیکھ کر جی خوش ہو گیا یا نہیں؟''

کملا: ''اب آپ بہکنے کیوں لگے؟''

مجید: ''بتلا کیا اپنا سر دوں، کبھی سامنے جانے کا اتفاق بھی تو ہوا ہو، کل کواڑ کی دراڑ سے ایک نظر دیکھ لیا تھا۔ ابھی تک تصویر نگاہوں کے سامنے پھر رہی ہے''

چندو لال: ''میرے یار! تو بڑا بلند اقبال مند ہے''

کملا: ''ایسا بے قرار ہوا کہ گرتے گرتے بچا، بس پری سمجھ لو''

مجید: ''تو بھائی دوستی کس کام آئے گی، ایک نظر ہمیں بھی دکھا دو''

سعید: ''بے شک دوستی کے یہی معنی ہیں کہ آپس میں کوئی پردہ نہ رہے۔ دوئی کا مسئلہ ہی القط ہو جائے''

چندو لال: ''دوستی میں کیا پردہ، انگریزوں کو دیکھو، بیوی ڈولی سے اتری نہیں کہ یار دوست ہاتھ ملانے لگے''

رام سیوک: ''مجھے تو بن دیکھے چین نہ آئے گا، ہیں تو پختہ؟''

کملا: (ایک دھول لگا کر) ''زبان کاٹ لی جائے گی سمجھے؟''

رام سیوک: ''کچھ پرواہ نہیں، آنکھیں تو دیکھنے کو رہیں گی''

مجید: ''بھئی کملا چرن برا ماننے کی کوئی بات نہیں، اب اس وقت تمہارا فرض ہے کہ دوستوں کی فرمائش پوری کرو''

کملا: ''ارے تو میں کب انکار کرتا ہوں''